(ادارہ)

نظامِ حکومت کیسا ہونا چاہیئے؟

روزنامہ نوائے وقت کو مدیر ترجمان کا انٹرویو

صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے ایک حالیہ اعلان کی روشنی میں کہ نظامِ حکومت کے متعلق بحث کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ نمائندہ نوائے وقت نے مدیر ترجمان کی خدمت میں مندرجہ سوالات کی ایک فہرست ارسال کی بخوشی ان کی طرف سے جوابات دیئے گیے وہ شائع کیے جا رہے ہیں۔ اس تمام مواد کو سنسر نہیں کیا گیا۔

(۱) مغربی نظامِ سیاست اور مغربی جمہوریت میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔؟

(۲) اسلامی نظامِ سیاست اور مغربی نظامِ سیاست یا جمہوریت میں آپ کیا بُعد محسوس کرتے ہیں۔؟

(۳) مغربی یا اسلامی نظام میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کا کیا مقام ہے؟

(۴) اسلامی نظامِ سیاست میں آپ مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے لیے کیا کردار متعین کرتے ہیں۔

(۵) پاکستان کے حالات کے لیے آپ کس نظام کو موزوں سمجھتے ہیں۔ اسلامی نظامِ سیاست یا مغربی جمہوریت؟

(۶) اسلامی نظامِ سیاست میں سربراہِ مملکت کا انتخاب براہِ راست ہو یا بالواسطہ؟

مغربی نظامِ سیاست میں جمہوریت کو ایک نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ یہ مقام ان علاقوں اور ملکوں کی اقوام نے بڑی لمبی جدّوجہد اور قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ میرے خیال میں مغربی نظامِ سیاست میں اس وقت جو چیز سب سے زیادہ خوبصورت، خوشنما اور دلکش ہے۔ وہ یہی جمہوریت ہے۔ میرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ مغرب والوں نے جمہوریت کا یہ درس اسلام اور رسولِ اسلام

سرورِ کائنات کی تعلیمات سے اخذ کیا ہے۔ جمہوریت ایک بہت وسیع المعنی لفظ ہے۔ جب میں جمہوریت کی بات کرتا ہوں تو اسے ایک خاص تناظر اور خاص پس منظر میں دیکھتا ہوں اور میری مراد اس وقت یہ ہوتی ہے کہ جمہوریت اس دنیا میں رائج تمام نظام ہائے سیاست میں اس لیے ممتاز اور نمایاں ہے کہ اس میں انسان کو بہت بڑی حد تک انسانوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔ ضمیر کی آواز دبانی نہیں پڑتی۔ آپ کے دل میں جو بات آتی ہے آپ اس کا معقول طریقوں کے ساتھ اظہار کر سکتے ہیں۔ چاہے وہ زبان سے ہو یا نوکِ قلم سے۔ اس میں نوکِ زبان یا نوکِ قلم ہی کی بڑائی اور بالادستی ہوتی ہے اور بات کو منوانے یا سمجھانے کے لیے نوکِ شمشیر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لیے جب سوچنے والے کو کہنے اور لکھنے کا حق حاصل ہو اور کہنے اور لکھنے پر قدغن یا پابندی نہ ہو تو سوچ مثبت راستوں پر گامزن رہتی ہے اور غلط راہوں کے اندھیروں میں اپنے گھوڑے نہیں دوڑاتی لیکن جب کہنے اور لکھنے پر پابندیاں عاید ہو جائیں تو ظاہر ہے ابھی تک دنیا میں کوئی ایسی چیز ایجاد نہیں ہوئی جو سوچ پر قدغن عائد کر سکے اور سوچ جب اپنے اظہار کے لیے ناجائز ہتھکنڈوں اور طریقوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

معروف مغربی نظام میں سیاست کا یہی ایک حسن ہے کہ اس نے اپنی لاتعداد خامیوں اور بے شمار نقائص پر جمہوریت کے حسن کا پردہ ڈال رکھا ہے جس سے اس کے عیوب اور نقائص ظاہر نہیں ہو پاتے۔ بلکہ ان کا بہت کچھ ازالہ بھی ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت کے مغربی تصور اور اور اسلامی تصور میں کیا فرق ہے۔ میں پہلے ہی اشارۃً اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک جمہوریت کی پیدائش اور نشو و نما اسلام کی آغوشِ شفقت میں ہوئی ہے۔ مغرب نے اس نظریہ کو اسلام ہی سے مستعار لیا ہے۔ تاہم اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ جب بھی کوئی فلسفہ اور فکر کسی ایک جگہ سے دوسری قوم کے پاس آتا ہے تو اس میں کچھ تبدیلیاں اور تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ کچھ مکان کے اثرات ہوتے اور کچھ مکین کے ہوتے ہیں، یعنی جس ملک میں کسی دوسرے فلسفہ کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اس ملک کے کچھ اپنے حالات اور ماحول اس فلسفہ کو بھی متاثر کرتا ہے اور اس پر اپنا رنگ چڑھاتا ہے جبکہ وہ فلسفہ بھی اپنی اثر آفرینی دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ اس طرح ہر قوم کے کچھ اپنے تقاضے اور لوازمات ہوتے ہیں۔ جو اس فلسفے کو اپنا رنگ "کلر" عطا کرتے ہیں۔ بعینہٖ جمہوریت کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ اسلام میں جمہوریت کا تصور یہ ہے کہ ہر شخص کو سوچ، فکر اور پھر اس سوچ کو وجود دینے کی اس پر عمارت استوار کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ ہر آدمی اپنے لیے جو راستہ چاہے متعین کر سکتا ہے اور اسے اس اختیار کردہ راستے کے اظہار اور اعلان کا بھی حق حاصل ہے۔ کوئی شخص یہ حق اور اختیار نہیں رکھتا کہ وہ اپنی کسی بھی برائی کی وجہ سے کسی دوسرے

انسان کو اس آزادی سے محروم کر سکے چاہے وہ بڑائی مال و دولت کی ہو، چاہے قوت طاقت کی ہو اور چاہے اقتدار و اختیار کی ہو۔ اس سلسلے میں اسلام نے بڑے واضح اصول متعین کیے ہیں قرآن مجید میں ہے (لا اکراہ فی الدین) کسی کو کوئی خاص مذہب اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا قرآن مجید میں دوسری جگہ آیا ہے "جس کا دل چاہے ایمان لائے اور جس کا دل چاہے راہ کفر اختیار کرے" ایک اور جگہ ارشاد ہے "آپ کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ہم نے انسان کو دونوں راہ دکھلا دیے ہیں۔ اچھائی اور برائی جو جی چاہے اختیار کرے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا جب کہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے" یہاں یہ بات تو واضح ہے کہ اسلام حریتِ فکر، حریت رائے، آزادی اظہار یعنی تقریر اور تحریر کی آزادی کا مکمل حامی ہے۔ اور یہی جمہوریت کی اصل روح اور بنیاد حقیقی ہے۔ اسلام کسی دوسرے دین، مذہب میں بھی جبر و تشدد کا قائل نہیں۔

یہاں تک تو مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ بلکہ ان کے ہاں بھی اصل اصول یہی ہے۔ اب فرق یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے وہ صرف معروف معنوں میں مذہب نہیں، بلکہ دین ہے اور دین وہ ہوتا ہے جو دنیا و آخرت کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ایک مکمل دستور اور کامل ضابطہ عطا کرے۔ دنیاوی مسائل چاہے معیشت کے ہوں یا معاش کے، معاشرتی ہوں یا عمرانی۔ سماجی ہوں یا خاندانی۔ عدل و انصاف کے یا نظم حکومت کے۔ مدنیت کے ہوں یا بشریت کے۔ دین ان تمام امور کے بارے میں ایک واضح متعین راہ عمل اجاگر اور آشکارا کرتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک دین ہے۔ اور اس کے ماننے والے اپنے آپ کو ایک خاص اور متعین راہ کے راہی قرار دیتے ہیں اس لیے وہ اس بات کے پابند ہو جاتے ہیں کہ وہ ایسی کوئی بات نہ کہیں اور کریں جو ان کے دین کے اساس، بنیادی نظریات اور معتقدات سے ٹکراتی ہو۔ اس کے برعکس اگر کوئی معاملہ ان کے دین کے بنیادی اصولوں کے منافی نہ ہوں۔ بلکہ دین کے اصولوں کی روشنی میں اسے اختیار کر لیا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں اور یہی اجتہاد ہے۔ اب ہم اصل بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔ مغرب والے چونکہ کسی دین کے پیروکار نہیں ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ مغربی دنیا عیسائیت کو ایک مذہب قرار دیتی ہے۔ دین نہیں۔ مذہب اور دین میں فرق یہ ہے کہ مذہب صرف آخرت کی طرف راہنمائی کرتا ہے یا زیادہ سے زیادہ روح کی افزائش اور طہارت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ جبکہ دین، دنیا اور آخرت دونوں سے معاملہ میں رہبری کرتا ہے۔ اور روح کی افزائش

اور طہارت کے ساتھ جسم کی بالیدگی اور پاکیزگی کا بھی خیال رکھتا ہے۔

مغرب کے لوگ چونکہ کسی دین کے پیروکار نہیں۔ اس لیے انہوں نے امور دنیا کو سرانجام دینے کے لیے جمہور کے منتخب نمائندوں کو جمہوریت کے نام پر قانون سازی کے حقوق تفویض کرا دیئے تاکہ وہ حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق قوم کی فلاح و بہبود اور ملک کی ترقی اور سربلندی کے لیے جو مناسب سمجھیں قانون اور دستور وضع کریں۔ کیونکہ دستور سازی اور قانون سازی کا حق جمہوری نمائندوں کو حاصل ہے اور رہے گا۔ اس لیے انہیں ان قوانین اور دستور کے مجموعہ میں تبدیلی اور ترمیم اور تنسیخ کا حق بھی حاصل ہوگا۔ اس کے برعکس اسلام چونکہ ایک دین ہے اور اس کے ماننے والے اسے دین سمجھ کر مانتے ہیں اور اس دین کے قوانین اور دستور کو خالق کائنات نے سرورِ کائنات پر نازل کیا ہے۔

جمہور کے نمائندے اس دستور اور اس کے قوانین کی حفاظت اجراء اور نفاذ کے ذمہ دار ہیں۔ تاہم خالق کے بنائے ہوئے قانون اور دستور کو مخلوق نہ توڑنے کا کوئی حق رکھتی ہے اور نہ استحقاق ہاں اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہونے کی وجہ سے اس ضابطہ کا ہی حامل ہے کہ پیش یا افتادہ مسائل کے حل کے لیے اس کے ازلی و ابدی اور سرمدی اصولوں کی روشنی میں، اہل حل و عقد یا دوسرے لفظوں میں فقہائے امت، علماء ملت اور اکابرین قوم مل بیٹھ کر اپنی قوم اور اپنے ملک کی بہبود کے لیے ضوابط وضع کریں لیکن مخصوص مسائل پر گفتگو ان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہوگی۔ یہ ہے وہ بنیادی فرق جو اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں پایا جاتا ہے۔ میں اس بات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک انسان کی آزادی کا تعلق ہے۔ یہ تصور اسلام نے دیا ہے اور مغربی اقوام نے اسے اسلام سے اخذ کیا ہے۔ لیکن وہ اپنے پاس کسی ضابطۂ حیات کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے جمہور کی معرفت قانون سازی اور آئین سازی کے معاملہ میں بے کسی کا شکار ہوگئے ہیں۔

اب مسئلہ پارلیمانی نظام کا ہے کہ آیا یہ اسلامی نظام کی روح کے مطابق ہے یا نہیں۔ جہاں تک نظام یا طرزِ حکومت کا تعلق ہے۔ اسلام نے اس سلسلے میں کسی خاص طریقہ کو کسی دوسرے طریقہ پر ترجیح نہیں دی۔ بلکہ جس طرزِ حکومت میں لوگوں کو آزادی۔ اظہار اور فکر و عمل حاصل ہو۔ ان کے حقوق محفوظ ہوں۔ ان کی جان و مال اور عزت کو تحفظ حاصل ہو۔ اور ان میں حدود اللہ قائم ہوں۔ اسلام ایسی ہی طرزِ حکومت کو جائز اور درست قرار دیتا ہے۔ اور اس میں یہ بات آ ہی جاتی ہے کہ ان پر

حکومت کرنے والا اپنے آپ کو اللہ اور اس کی مخلوق کے سامنے جواب دہ سمجھے اور اپنے اختیارات میں ان حدوں سے تجاوز نہ کرے جو اللہ اور اس کے رسول ؐ نے مقرر کی ہیں اب سوال یہ ہے کہ آج کے دور میں اس طرز حکومت سے کونسا سسٹم زیادہ قریب ہے ۔ میری رائے میں پارلیمانی نظام حکومت سے زیادہ اسلام کے قریب اور کوئی طرز حکومت موجود نہیں اس نظام میں حکمران کے اختیارات محدود ہوتے ہیں ۔ دوسرے عامتہ الناس کے نمائندگان اس پر ہمہ وقت روک ٹوک کر سکتے ہیں اور اس کے کسی بھی عمل اور دخل پر اس کی باز پرس اور جوابدہی کا حق رکھتے ہیں ۔ اس نظام کے تحت پارلیمنٹ کے ارکان کو جو عامتہ الناس کے نمائندے ہوتے ہیں ۔ بہتر اور اچھے حکمران منتخب کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں اور جب اس کی کارکردگی یا اس کی صلاحیتوں میں فرق یا خلل پڑ جائے تو وہ اسے معزول کرنے اور اس کی جگہ کسی دوسرے کو فوری طور پر امیر منتخب کرنے کا حق رکھتے ہیں ۔ تاکہ نہ تو ضروری امور حکومت میں خلل پڑے اور نہ ہی ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہو ۔ یہی اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہے ۔ خلافت راشدہ میں بھی اسی طرح کا سسٹم رائج تھا ۔ جسے آجکل پارلیمانی سسٹم کہا جاتا ہے ۔ حضرت صدیق اکبر ؓ جو سرور کائنات کے ملأ اعلیٰ کے پاس منتقل ہو جانے کے بعد امت کے پہلے حکمران تھے ۔ ان کا انتخاب بھی اسی طرح عمل میں آیا تھا ۔ مہاجرین اور انصار کے نمائندوں کا ایک اجتماع ثقیفہ بنی ساعدہ میں جو اس عہد کی پارلیمان تھی منعقد ہوا اور اس میں انہی نمائندگان مہاجرین و انصار نے حضرت صدیق اکبر ؓ کو حکومت کے لیے منتخب کیا ۔ میرے نزدیک پارلیمانی نظام حکومت کی اس سے بہتر کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی ۔ حضرت علی ؓ نے اپنی خلافت کی صحت کے لیے انہی نمائندگان مہاجرین اور انصار کے ووٹوں کو اپنے لیے حکمرانی یا اسلامی اصطلاح میں خلافت کی بحث و حقانیت کی دلیل ضروری ۔ میری یہ خواہش ہے کہ علماء امت اور فقہاء ملت کے ساتھ ساتھ اکابرین سیاست بھی اس بات پر توجہ دیں ۔ اسلام میں انتخاب کے سوا حکمران بننے کے لیے کوئی اور راستہ موجود ہوتا تو حضرت علی ؓ جیسی برگزیدہ اور اہل بیت کی سربرآوردہ شخصیت اس کا تذکرہ ضرور فرماتی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ پارلیمانی سسٹم کیا ہے ۔ امت کے نمائندگان کا انتخاب اور ان منتخب شدہ لوگوں کی طرف سے حکمرانوں کا تعین یہاں کوئی شخص یہ نہ کہے کہ مہاجرین اور انصار اہل حل و عقد کو کس نے معین کیا تھا ۔ اس دوران قبائلی نظام میں قبیلے کے سربراہ انتخاب کے ذریعے ہی منتخب ہوتا تھا ۔ اور ایسے لوگ پارلیمنٹ کے ممبران کی طرح نامور اور شہرت یافتہ ہوتے ہیں ۔ ان حالات میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں حکمرانوں پر کنٹرول رکھنے کے لیے عوام کے سامنے